

ہے۔ کبھی کبھی ایسے فقرے بھی استعمال کئے جاتے ہیں کہ ان کے مجازی معنوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب یہ جملہ دیکھئے:

دریا بہتا ہے۔

ہم کہتے تو ہیں کہ دریا بہتا ہے لیکن وہاں دریا نہیں بلکہ پانی بہتا ہے۔ دریا اپنی جگہ پر رہتا ہے۔

اس طرح اگر استعارہ میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق پایا جائے تو اسے مجاز کہتے ہیں۔

کنایہ

اوپر آپ نے پڑھا کہ استعارہ میں کسی لفظ کے صرف مجازی معنی لئے جاتے ہیں کبھی کبھی ایسے فقرے بھی آ جاتے ہیں جن کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی لئے جاتے ہیں۔ جیسے یہ جملہ ہے:

یہ شخص بڑے جو توں والا ہے۔

اس کے ایک معنی تو وہی ہیں جو اس جملے سے نکلتے ہیں۔ دوسرا مطلب بڑے پاؤں والا ہوتا ہے۔

پہلا مطلب حقیقی ہے اور دوسرا مجازی۔

ایسا اظہار بیان جس میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی لئے جاسکتے ہوں کنایہ کہلاتا ہے۔

مشق

- 1- تشبیہ کی تعریف کیجئے اور اس کی دو مثالیں دیجئے۔
- 2- تشبیہ اور استعارہ میں کیا فرق ہے؟
- 3- استعارہ اور کنایہ کی تعریف کرتے ہوئے ان دونوں کے فرق کو واضح کیجئے۔
- 4- ان جملوں میں تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ کو الگ الگ کر کے لکھئے۔
 - (۱) چراغ جل رہا ہے۔
 - (۲) یہ لڑکا لومڑی ہے۔
 - (۳) کاغذ دودھ کی طرح سفید ہے۔
 - (۴) امجد کی زبان تیز چلتی ہے۔
 - (۵) یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟
 - (۶) دودھ تو بالکل پانی ہے۔

صنائع بدائع

زبان کی طرح شعر میں حسن اور زور پیدا کرنے کا بھی خاص علم ہے۔ اس علم کو علم بدیع یا صنائع بدائع کہا جاتا ہے۔ یہ حسن صنعتوں کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں یعنی شعر میں حسن یا زور دو طرح سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک الفاظ کی مدد سے دوسرے معنوی اعتبار سے۔

لفظی اعتبار سے شعر میں حسن پیدا کرنے کو صنائع لفظی کہتے ہیں اور معنوی اعتبار سے شعر میں حسن پیدا کرنے کو صنائع معنوی کہتے ہیں۔

صنائع لفظی میں سے ایک صنعت تجنیس ہے، اور صنائع معنوی کی اہم قسموں میں لف و نشر، تضاد، تلمیح، مراعات النظر اور حسن تعلیل وغیرہ ہیں۔

صنائع لفظی

تجنیس

یہ صنائع لفظی کی ایک قسم ہے اور اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شعر میں ایسے دو لفظ لائے جائیں جو دیکھنے میں تو ایک طرح کے ہوں لیکن ان کے معنی الگ الگ ہوں۔ جیسے ذیل کے شعر میں ”مرمر“ کا لفظ ہے۔

جتنے مرمر گئے بتو! تم پر
ان کے مرقد ہیں سنگ مرمر کے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں مرمر گئے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعے میں سنگ مرمر کا لفظ لایا گیا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں مرمر کا حصہ عام ہے مگر پہلے مصرعے میں موت کے معنی میں آیا ہے اور دوسرے مصرعے میں پتھر کی ایک قسم کے معنی میں۔

صناع معنوی

لف و نشر

شعر ہے:

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں

نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں چار چیزیں لائی گئی ہیں۔ (۱) ہمت، (۲) قسمت، (۳) دل، (۴) آنکھیں۔ ان چار چیزوں کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں چار چیزیں لائی گئی ہیں۔ (۱) ڈھونڈا، (۲) پایا، (۳) سمجھا اور (۴) دیکھا۔

ہمت کا تعلق ڈھونڈا سے، قسمت کا تعلق پایا سے، دل کا تعلق سمجھا سے اور آنکھیں کا تعلق دیکھا سے قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح شعر میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں الفاظ لائے جائیں تو اس صنعت کو لف و نشر کہتے ہیں۔

کبھی یہ تعلق بالترتیب ہوتا ہے اور کبھی ترتیب الٹ دی جاتی ہے یا آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔ جب یہ ذکر بالترتیب ہوتا ہے تو اسے لف و نشر مرتب کہتے ہیں۔ اوپر دیا ہوا شعر لف و نشر مرتب کی مثال ہے۔

اگر یہ ترتیب آگے پیچھے ہو جائے یا الٹ جائے تو اسے لف و نشر غیر مرتب کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ شعر:

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

تضاد

شاعر اپنے کلام میں کبھی ایسے الفاظ لے آتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں:

کیا تھنسنے اور خاک کوئی رو سکے
جی ٹھکانا ہو تو سب کچھ ہو سکے

اس شعر میں ہنسے اور اسکے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

کلام میں جب ایسے الفاظ لے آئے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اس صنعت کو تضاد کہا جاتا ہے۔

تلمیح

کبھی شاعر شعر میں کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جیسے یہ شعر ہے:

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اس شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس طرح کلام میں اگر کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہو تو اس صنعت کو تلمیح کہا جاتا ہے۔

حسن تعلیل

کبھی کبھی شاعر اپنے شعر میں اثر پیدا کرنے کے لئے کسی واقعہ یا عمل کا اصلی سبب چھوڑ کر کوئی دوسرا دلچسپ اور شاعرانہ سبب بیان کرتا

ہے۔ جیسے:

پیاسی تھی جو سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

اس شعر میں ساحل سے موجوں کے ٹکرانے کے عمل کو امام حسین کے
پیا سے ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ اسے
شاعرانہ استدلال کہتے ہیں۔ یہ ایک صنعت ہے جسے حسن تعلیل کہتے ہیں۔ اس
میں کسی واقعہ یا عمل کا اصلی اور حقیقی سبب چھوڑ کر کوئی دوسرا دلچسپ اور شاعرانہ
سبب بیان کیا جاتا ہے۔

مراعات النظر

اگر دونوں مصرعوں میں ایسی اشیاء کا ذکر کیا جائے جن میں باہم
مناسبت پائی جائے تو شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:
بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

پہلے مصرعے میں بوئے گل (خوش بو)، نالہ (آہ) اور دود
(دھواں) تینوں اپنی صفت میں باہم مناسبت رکھتی ہیں یعنی ان کی خصوصیت فضا
میں بکھر جانے کی ہے۔ اس مناسبت سے دوسرے مصرعے میں ”پریشان“ کا

لفظ لایا گیا ہے۔ جس کے معنی بکھرنے یا منتشر ہونے کے ہیں۔ اس صنعت کو مراعات النظر کہتے ہیں۔

مراعات النظر وہ صنعت ہے جس میں کلام میں ایسی اشیاء کا ذکر لایا جائے یا ایسے الفاظ لائے جائیں جن میں باہم مناسبت ہو۔

مشق

حل کیجئے:

- 1- صنائع لفظی اور صنائع معنوی میں کیا فرق ہے؟
- 2- تجنیس کس صنعت کو کہتے ہیں؟ تعریف کرتے ہوئے دو مثالیں دیجئے۔
- 3- لف و نشر مرتب اور لف و نشر غیر مرتب میں کیا فرق ہے۔
- 4- تلمیح کسے کہتے ہیں؟ مثالیں دیجئے۔
- 5- حسن تعلیل کی تعریف کیجئے۔
- 6- بتائیے ان اشعار میں آپ کو کون کونسی صنعتیں ملتی ہیں؟

(1) خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

(2) اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات

ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

(3) دل غرق تفکر میں محو آنکھ تحیر میں

لنگرتہ دریا ہے کشتی سر ساحل

(4) سچ ہے، پرانی آگ میں پڑتا نہیں کوئی

ہمراہ کوہ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

(5) اسی باعث سے دایہ طفل کوافیون دیتی ہے

کہتا ہو جائے لذت آشنا تلخیء دوراں سے

ابو خاں کی بکری

ڈاکٹر ذاکر حسین

ہمالیہ پہاڑ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اس سے بڑا پہاڑ دنیا میں کوئی نہیں ہے ہزاروں میل چلا گیا ہے۔ اس پہاڑ کے اندر بہت سی بستیاں بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی الموڑہ بھی ہے۔ الموڑہ میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ جن کا نام تھا ابو خاں، انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے۔ دن بھر چراتے پھرتے۔ ان کے عجیب و غریب نام رکھتے کسی کا ”کلو“، کسی کا منگلیا کسی کا ”گوجری“، کسی کا ”کلمہ“۔ ان سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ شام کے وقت بکریوں کو لے کر گھر میں باندھ دیتے۔ الموڑہ پہاڑی جگہ ہے اس لیے ابو خاں کی بکریاں بھی پہاڑی نسل کی ہوتی تھیں۔

ابو خاں بے چارے تھے بڑے بدنصیب۔ ان کی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رستی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں۔ پہاڑی بکری بندھے بندھے گھبرا جاتی ہے۔ یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ میں چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا۔ وہ انھیں کھا جاتا تھا مگر عجیب بات ہے، نہ بھیڑیے کا ڈر، نہ ابو خاں کا

پیار، نہ شام کے دانے کا لالچ ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہاڑی جانوروں کے مزاج میں آزادی کی بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اپنی آزادی کسی قیمت پر دینے کو راضی نہیں ہوتے اور مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام و آسائش کی قید سے اچھا جانتے ہیں۔

جہاں کوئی بکری بھاگ نکلی اور ابو خاں بے چارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہری ہری گھاس میں انھیں کھلاتا ہوں، شام کو دانہ دیتا ہوں، مگر یہ کم بخت نہیں ٹھہرتیں اور پہاڑ میں جا کر بھیڑیے کو اپنا خون پلانا پسند کرتی ہیں۔

جب ابو خاں کی بہت سی بکریاں بھاگ گئیں تو بے چارے بہت اداس ہوئے اور کہنے لگے ”اب بکری نہ پالوں گا۔ زندگی کے تھوڑے دن اور ہیں، بے بکریوں ہی کے کٹ جائیں گے۔“ مگر تنہائی بری چیز ہے۔ تھوڑے دنوں ابو خاں بے بکریوں کے رہے مگر نہ رہا گیا۔ ایک دن کہیں سے ایک بکری خرید لائے یہ بکری ابھی بچہ ہی تھی۔ ابو خاں نے سوچا کہ کم عمر بکری لوں گا تو شاید ہل جائے اور اسے جب پہلے ہی سے اچھے اچھے چارے دانے کی عادت پڑ جائے گی تو پھر یہ پہاڑ کا رخ نہ کرے گی۔

یہ بکری تھی خوب صورت۔ رنگ اس کا بالکل سفید تھا۔ بال لمبے

لمبے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کالے سینگ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کسی نے کالی لکڑی میں خوب محنت سے تلاش کر بنائے ہیں۔ لال لال آنکھیں تم دیکھتے تو کہتے ارے یہ بکری تو ہم نے لے لی ہوتی۔ یہ بکری دیکھنے ہی میں اچھی نہ تھی مزاج میں بھی بہت اچھی تھی۔ پیار سے ابو خاں کے ہاتھ چاٹتی تھی۔ دودھ چاہے تو کوئی بچہ دودھ لے۔ نہ لات مارتی تھی نہ دودھ کا برتن گراتی تھی۔

ابو خاں بس اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس کا نام ”چاندنی“ رکھا تھا اور دن بھر اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی چچا ”گھسیٹے خان“ کا قصہ اسے سناتے تھے۔ کبھی ”مامونٹھو“ کا۔

ابو خاں نے یہ سوچ کر کہ یہ بکریاں شاید میرے تنگ آنگن میں گھبراتی ہیں، اپنی اس بکری چاندنی کے لیے نیا انتظام کیا تھا۔ گھر کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اس کے بیچ میں چاندنی کو باندھتے تھے۔ اور رسی بہت لمبی رکھتے تھے کہ خوب ادھر ادھر گھوم سکے۔ اس طرح چاندنی کو ابو خاں کے یہاں خاصا زمانہ گزر گیا اور ابو خاں کو یقین ہو گیا کہ آخر ایک بکری تو ہل گئی، اب یہ نہ بھاگے گی۔

مگر ابو خاں دھوکے میں تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی آسانی سے دل سے نہیں مٹتی۔ پہاڑ اور جنگل میں رہنے والے آزاد جانوروں کا دم گھر کی چار

دیواری میں گھٹتا ہے تو کانٹوں سے گھرے ہوئے کھیت میں بھی انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ قید سب ایک سی۔ تھوڑے دن کی لیے چاہے دھیان بٹ جائے مگر پھر پہاڑ اور جنگل یاد آتا ہے اور قیدی اپنی رستی تڑانے کی فکر کرتا۔ ابو خاں کا خیال ٹھیک نہ تھا کہ چاندنی پہاڑ کی ہوا بھول گئی ہے۔

ایک دن صبح جب سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے ہی تھا کہ چاندنی نے پہاڑ کی طرف نظر کی۔ منہ جو جگالی کی وجہ سے چل رہا تھا رک گیا اور چاندنی نے دل میں کہا وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی حسین ہیں۔ وہاں کی ہوا اور یہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ۔ پھر وہاں اچھلنا کودنا اور ٹھوکریں کھانا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ گردن میں آٹھ پہریہ کم بخت رستی۔ ایسے گھروں میں گدھے اور خچر ہی بھلے چک لیں ہم بکریوں کو تو ذرا بڑا میدان چاہیے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ چاندنی اب وہ پہلی سی چاندنی نہ تھی۔ نہ اسے ہری ہری گھاس اچھی لگتی تھی۔ نہ پانی مزہ دیتا تھا، نہ ابو خاں کی لمبی داستانیں بھاتی تھیں۔ روز بروز دہلی ہونے لگی۔ دودھ گھٹنے لگا۔ ہر وقت منہ پہاڑ کی طرف رہتا۔ رستی کو کھینچتی اور عجیب درد بھری آواز سے ”میں میں“ چلاتی۔ ابو خاں سمجھ گئے کہ ہونہ ہو کوئی بات ضرور ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا؟

ایک دن صبح جب ابو خاں نے دودھ لیا تو چاندنی نے ان کی طرف منہ پھیرا اور اپنی بکریوں والی زبان میں کہا ”ابومیاں! اب میں تمہارے پاس رہوں گی تو مجھے بڑی بیماری ہو جائے گی مجھے تم پہاڑ ہی پر چلے جانے دو۔

ابو خاں، بکریوں کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ چلا کر بولے ”یا اللہ! یہ بھی جانے کو کہتی ہے، یہ بھی!“ ہاتھ کے تھر تھرانے سے مٹی کی لٹیا جس میں دودھ دو ہاتھ ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔

ابو خاں وہیں گھاس پر بکری کے پاس بیٹھ گئے اور نہایت غمگین آواز میں پوچھا کیوں بیٹی چاندنی! تو بھی مجھے چھوڑنا چاہتی ہے۔“

چاندنی نے جواب دیا ”ہاں ابومیاں، چاہتی تو ہوں“ ”ارے کیا تجھے چارہ نہیں ملتا، یاد انا پسند نہیں، بنیوں فی گھنے دانے ملا دیے ہیں؟ میں آج ہی اور دانے لے آؤں گا۔“

”نہیں، نہیں میاں! دانے کی کوئی تکلیف نہیں“ چاندنی نے

جواب دیا۔

تو پھر کیا رستی چھوٹی ہے؟ میں اور لمبی کر دوں؟“

چاندنی نے جواب دیا ”اس سے کیا فائدہ؟“

”تو آخر پھر بات کیا ہے؟ تو چاہتی کیا ہے؟“ چاندنی نے جواب دیا ”کچھ نہیں، بس مجھے پہاڑ پر جانے دو“

ابو خاں نے کہا ”اری کم بخت تجھے یہ خبر ہے کہ وہاں بھیڑیا رہتا ہے۔ جب وہ آئے گا تو کیا کرے گی؟“

چاندنی نے جواب دیا ”اللہ نے دو سینگ دیے ہیں۔ ان سے اسے ماروں گی۔“

”ہاں ہاں ضرور!“ ابو خاں بولے ”بھیڑیے پر تیرے سینگ ہی کا اثر ہوگا۔ وہ تو میری کئی بکریاں ہڑپ کر چکا ہے۔ ان کے سینگ تو تجھ سے بڑے تھے۔ تو کلو کو جانتی نہیں۔ وہ پچھلے سال تھی۔ بکری کا ہے کو تھی، ہرن تھی۔ رات بھر سینگوں سے بھیڑیے کی ساتھ لڑی۔ مگر پھر صبح ہوتے ہوتے اس نے دبوج ہی لیا اور کھالیا۔“

چاندنی نے کہا ”ارے بے چاری کلو! مگر خیر ابومیاں اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے پہاڑ پر جانے ہی دو۔“

ابو خاں کچھ جھنجھلائے اور بولے ”یا اللہ یہ بھی جاتی ہے۔ میری بکری اور اس کم بخت بھیڑیے کے پیٹ میں جائے گی! مگر نہیں نہیں، میں اسے ضرور بچاؤں گا۔ کم بخت احسان فراموش! تیری مرضی کے خلاف تجھے بچاؤں گا۔ اب تیرا ارادہ معلوم ہو گیا ہے۔ اچھا بس چل، تجھے کوٹھری میں باندھا کروں گا۔ نہیں تو موقع پا کر چل دے گی۔

ابو خاں نے چاندنی کو ایک کونے کی کوٹھری میں بند کر دیا اور اوپر سے زنجیر چڑھا دی۔ مگر غصے اور جھنجھلاہٹ میں کوٹھری کی کھڑکی بند کرنا بھول گئے۔ ادھر انھوں نے کنڈی چڑھائی اور چاندنی کھڑکی میں سے یہ جاوہ جا۔

چاندنی پہاڑ پر پہنچی تو اس کی خوشی کا کیا پوچھنا تھا۔ پہاڑ پر بیڑ اس نے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن آج ان کا اور ہی رنگ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کھڑے ہوئے اسے مبارک باد دے رہے ہیں کہ پھر ہم میں آ ملی۔ ادھر ادھر سیوتی کے پھول مارے خوشی کے کھل کھل کر ہنس رہے تھے۔ کہیں اونچی اونچی گھاس اس سے گلے مل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا پہاڑ مارے خوشی کے مسکرا رہا ہے اور اپنی بچھڑی ہوئی بچی کے واپس آنے پر پھولا نہیں سماتا۔ چاندنی کی خوشی کا کیا حال بتائیں۔ نہ چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ، نہ کھونٹا، نہ رستی اور نہ چارا۔ وہ جڑی بوٹیاں کہ ابو خان غریب اپنی ساری محبت اور پیار کے باوجود لا سکتے۔

چاندنی کبھی ادھر اچھلتی، کبھی ادھر۔ یہاں کودی وہاں پھاندی، کبھی چٹان میں، کبھی کھڈ میں۔ ادھر ذرا پھسلی، ادھر ذرا سنبھلی۔ ایک چاندنی کے آنے سے سارے پہاڑ پر رونق سی آگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابو خاں کی دس بارہ بکریاں چھوٹ کر یہاں آگئی ہیں۔

ایک دفعہ گھاس پر منہ مار کر اٹھایا تو، چاندنی کی نظر ابو خاں کے مکان اور اس کے کانٹوں والے باڑے پر پڑی۔ انھیں دیکھ کر خوب ہنسی اور کہنے لگی ”یا خدا! کوئی دیکھے تو کتنا ذرا سا مکان ہے اور کیسا چھوٹا سا باڑا۔ یا اللہ میں اس میں اتنے دن کیسے رہی؟ اس میں آخر سماتی کیسے تھی؟“ پہاڑ کی چوٹی پر سے اس ننھی سی جان کو نیچے کی ساری دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔

چاندنی کے لیے یہ دن بھی عجیب تھا۔ دو پہر تک اتنی اچھلی کودی کہ شاید ساری عمر میں اتنی نہ کودی ہوگی۔ دو پہر ڈھلے اسے پہاڑی بکریوں کا گلہ دکھائی دیا گلے کی بکریوں نے اسے خوشی خوشی اپنے پاس بلایا اور اس سے حال احوال پوچھا۔

چاندنی کو ابھی آزادی کی اتنی خواہش تھی کہ اس نے گلے کے ساتھ ہو کر ابھی سے اپنے اوپر پابندیاں لینا گوارا نہ کیا اور ایک طرف چل دی۔ شام کا وقت ہوا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سارا پہاڑ لال سا ہو گیا۔ اور چاندنی

سوچا: اوہو! ابھی سے شام؟ نیچے ابو خاں کا گھر اور وہ کانٹوں والا باڑا، دونوں گھر میں چھپ گئے۔ نیچے کوئی چرواہا اپنی بکریوں کو باڑے میں بند کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ ان کی گردن کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چاندنی اس آواز کو خوب پہچانتی تھی۔ اسے سن کر اداس سی ہو گئی۔ ہوتے ہوتے اندھیرا ہونے لگا اور پہاڑ میں سے ایک آواز آئی ”خو..... و..... و..... خو“۔

یہ آواز سن کر چاندنی کو بھیڑیے کا خیال آیا۔ دن بھر ایک دفعہ بھی اس کا دھیان ادھر نہ گیا تھا پہاڑ کے نیچے سے ایک سیٹی اور ایک بگل کی آواز آئی۔ یہ بے چارے ابو خاں تھے۔ جو آخری کوشش کر رہے تھے کہ اسے سن کر چاندنی بھی لوٹ آئے۔ ادھر یہ کہہ رہے تھے کہ ”لوٹ آؤ، لوٹ آؤ۔ ادھر سے دشمن جان بھیڑیے کی آواز آرہی تھی۔ چاندنی کے دل میں کچھ تو آئی کہ لوٹ چلیں۔ لیکن اسے کھوٹا یاد آیا۔ رستی یاد آئی۔ کانٹوں کا گھریا د آیا اور اس نے سوچا کہ اس زندگی سے یہاں کی موت اچھی ہے۔ آخر کو سیٹی اور بگل کی آواز بند ہو گئی۔ پیچھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ چاندنی نے مڑ کر دیکھا تو دوکان دکھائی دیے۔ سیدھے کھڑے ہوئے، اور دو آنکھیں جو اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ بھیڑیا سر پر پہنچ گیا تھا۔

بھیڑیا زمین پر بیٹھا تھا۔ نظر بے چاری بکری پر جمی تھی۔ اسے اطمینان تھا۔ جلدی نہ تھی۔ خوب جانتا تھا کہ اب کہاں جاتی ہے؟ بکری نے

جو اس کی طرف رُخ کیا تو یہ مسکرایا اور بولا ”اوہو! ابو خاں کی بکری ہے۔
خوب کھلا کھلا کر موٹا کیا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی لال لال زبان نیلے نیلے ہونٹوں پر پھیری چاندنی
کو کلو کا قصہ یاد آیا جو ابو خاں نے سنایا تھا اور اس نے سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ
رات بھر لڑ کر صبح جان دوں۔ ابھی کیوں نہ اپنے آپ کو سپرد کر دوں۔ لیکن پھر خیال
آیا کہ نہیں اپنا سر جھکایا۔ سینگ آگے کو کیے اور پینترا بدل کر بھیڑیے کے مقابل آئی
کہ بہادروں کا یہی کام ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ چاندنی اپنی بساط نہ جانتی تھی اور
بھیڑیے کی طاقت کا اسے اندازہ نہ تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں
مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ ضروری ہے۔ جی
میں سوچتی کہ میں کلو کی طرح رات بھر مقابلہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔

کچھ دیر جب گزر گئی تو بھیڑیا بڑھا۔ چاندنی نے بھی سینگ سنبھالے
اور وہ حملے کیے ہیں کہ بھیڑیے کا جی جانتا ہوگا۔ بیسیوں مرتبہ اس نے بھیڑیے کو پیچھے
ریل دیا ساری رات اسی میں گزری۔ کبھی کبھی چاندنی اوپر آسمان کی طرف اور
ستاروں سی آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیتی ”اے کاش اس طرح صبح ہو جائے۔“

ستارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ چاندنی نے آخری
وقت میں اپنا زور دوگنا کر دیا۔ بھیڑیا بھی تنگ آ گیا تھا کہ دودھ سے

اسے روشنی سی دکھائی دی۔ نیچے بستی میں مسجد سے اذان کی آواز آئی چاندنی نے دل میں کہا ”اللہ! تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی۔ موذن آخری مرتبہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا۔ چاندنی بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے۔ وہ مصر ہے کہ ”چاندنی جیتی“۔

I مختصر سوالات:

- (1) ابو خان کون تھے اور کہاں رہتے تھے؟
- (2) ابو خان کو کس چیز کا شوق تھا؟
- (3) ابو خان نے اپنی بکریوں کے کیا نام رکھے تھے؟
- (4) بکریاں رستی تڑا کر کیوں چلی جاتی تھیں؟
- (5) اپنی بکری چاندنی کے لئے ابو خاں نے کیا نیا انتظام کیا؟
- (6) ابو خاں صبح جب دودھ دوہنے کے لئے گئے تو چاندنی نے کیا کہا؟
- (7) ابو خان نے جب چاندنی کو کوٹھری میں بند کیا تو اس نے کیا کیا؟
- (8) چاندنی جب پہاڑ پر پہنچی تو اسے کیسا لگا؟
- (9) ابو خان کی سیٹی اور بگل کی آواز سن کر چاندنی نے کیا سوچا؟

(10) چاندنی نے مسجد سے اذان کی آواز سن کر دل میں کیا کہا؟

II توضیحی سوالات:

(1) ابو خان کی بکریاں پہاڑی پر کیوں بھاگ جاتی تھیں

(2) پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھ کر چاندنی کے دل میں کیا خیالات آئے اور اُس

نے کیا کیا؟

(3) چاندنی نے بھیڑیے کا مقابلہ کیا سوچ کر کیا؟

(4) چاندنی اور بھیڑیے کی لڑائی اپنے الفاظ میں لکھئے؟

(5) ابو خان کے کردار پر روشنی ڈالئے؟

نام دیو مالی

مولوی عبدالحق

نام دیو مالی کا تعلق نچلی ذات سے تھا۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں ہیں۔ یہ خوبیاں نچلی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں قیس ہو، کوہ کن ہو یا حالی عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں۔ جس باغ میں وہ کام کرتا تھا وہ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کیا اور ہر رخ سے پودے کو مر مڑ کر دیکھا۔ پھر اٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگا رہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا، مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش کرتا۔ ان کو سرسبز و شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی ہر دوڑ جاتی تھی۔ کبھی کسی پودے کو اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگواتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا۔ جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی

اسے علاج کے لئے بلاتے۔ بلاتال چلا جاتا مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہ لیتا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی چمن کو بھی رکھتا تھا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ باغ کے دروغہ عبدالرحیم خاں خود بھی بڑے کار گزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ مالیوں کو اکثر ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے، ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے، لیکن نام دیو سے کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جونچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھرا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کی اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کر لانا شروع کیا۔ پانی

کیا تھایوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کپچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی
پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے
انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام
کا مستحق نہیں ہوتا۔ جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش گوار آب و
ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات کی سپرد
ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پر کھنے میں
بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اسے شاہی باغ میں لے
گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران اور بیسیوں مالی۔ اور مالی
بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔
ان کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اہلی تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت
میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ
فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا، البتہ کام کی
دھن تھی، کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی
اس کا کام مہا کاج رہا۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک
سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی۔ اس پر بھی اپنے غریب

بھائیوں کی مدد کرتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا، لیکن اسے کبھی خیال نہ آیا کہ بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا نیکی نیکی نہیں رہتی۔ جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے؟ بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔ تھا تو خلی ذات کا، پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

I مختصر سوالات:

- (1) نام دیو مالی کس ذات کا آدمی تھا؟
- (2) نام دیو کی کون سی حرکتیں دیکھ کر مصنف کو تعجب ہوتا تھا؟
- (3) نام دیو کس کو اپنی اولاد سمجھتا تھا؟

- (4) نام دیو پودوں کی کس طرح سیوا کرتا تھا؟
- (5) نام دیو کو کس کے علاج کرنے میں مہارت تھی؟
- (6) نام دیو کا چمن ہرا بھرا کیوں تھا؟
- (7) نام دیو کس مزاج کا آدمی تھا؟
- (8) مصنف نام دیو کی طرف کیوں متوجہ ہوا؟

II توضیحی سوالات:

- (1) نام دیو کی لگائے ہوئے پودے کیوں ضائع نہیں ہوتے تھے؟
- (2) بچوں اور گاؤں والوں کی وہ کیا ضرورت پوری کرتا تھا؟
- (3) خشک سالی میں نام دیو نے اپنے باغ کو کیسے بچایا؟
- (4) نام دیو کو کبھی ڈانٹنے کی ضرورت کیوں نہ ہوتی تھی؟
- (5) نام دیو کے کردار پر روشنی ڈالئے؟

صلیب

ڈاکٹر عابد صفی

فسٹ کلاس ویٹنگ روم میں اس خاتون کے سوا اور کوئی نہ تھا!

میں نے اٹیچی نیچے رکھ کر گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے۔ گاڑی کے لئے ابھی دیر ھ گھنٹہ باقی تھا ویٹنگ روم کے اندر بیٹھے بیٹھے دیر ھ گھنٹہ گزارنا میری بس کی بات نہ تھی۔ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ پلیٹ فارم پر چل کر گھوم پھر بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ دس ہی منٹ میں میرا دم گھٹنے لگا اور جس سے نکلنے کے لیے میرے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اس خاتون سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا جائے۔ اس طرح انتظار اور تنہائی کی گھڑیاں شاید ٹل جائیں۔ اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر میں نے ایک رسمی قسم کے سوال سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ پھر باتوں کا سلسلہ آگے بڑھا تو غیرت اور تکلف کی دیوار بھی آہستہ آہستہ گرتی چلی گئی اور پھر یہ ہوا کہ دس ہی منٹ کے اندر نہ صرف ہم نے ادھر ادھر کی ڈھیر ساری باتیں کر ڈالی تھیں بلکہ اس نے میری چائے بھی قبول کر لی تھی! لیکن ہم نے اب تک ایک دوسرے کی ذات سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جان سکا تھا کہ آیا وہ کنواری ہی ہے یا اس کی شادی ہو چکی ہے۔

چائے پیتے پیتے اچانک اس نے ہونٹوں سے پیالی ہٹالی۔

”میری حماقت تو دیکھئے کہ آپ کی چائے تو قبول کر لی لیکن نہ اپنے متعلق کچھ بتایا اور نہ آپ کے بارے میں کچھ پوچھا“ اس کی مترنم ہنسی کانوں میں رس گھول گئی۔“

”تو کیا ہو گیا۔ اب بھی اپنا تعارف پیش کر کے یہ حساب بے باق کر سکتی ہیں آپ!“

سرخی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر آئی اور گزر گئی۔ اس کے جھپٹنے کا یہ انداز مجھے بڑا پیارا لگا۔ اتنے میں بیرا آ گیا اور میں بل چکانے کے بعد پھر اس کے طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجھے ثریا کہتے ہیں بمبئی میں رہتی ہوں وہیں میرے شوہر کی فونڈری ہے۔“ اس نے اپنا تعارف پیش کیا۔

”اور مجھے پرویز کہتے ہیں چینی کا باشندہ ہوں۔“

”سچ! آپ چینی کے ہیں؟ مجھے چینی بہت پسند ہے۔“

”اس بات سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرا وطن آپ کو بھی پسند ہے ورنہ آج کل تو ایک صوبہ کے لوگ دوسرے صوبے کا نام سن کر ہی نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔“

”وہ تو ہمارا تعصب اور ہماری تنگ نظری ہے جو ہمیں کہیں کا نہیں رکھے گی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں بھی چینی ہی کی رہنے والی ہوں۔“

”سچ؟“

”ہاں!“

اس مختصر سے جواب کے بعد وہ خاموش ہو گئی لیکن میرے اندر اس اطلاع سے خوشی کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔ سفر میں یا وطن سے دور کسی ہم وطن کا مل جانا واقعی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

”پتہ نہیں اب چینی کا کیا حال ہے؟“ اس کے بجھے بجھے لہجہ پر میں چونک پڑا۔ ابھی ابھی تو وہ بڑی خوش نظر آئی تھی۔ اب اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔

چینی چھوڑے کافی دن تو نہیں ہو گئے آپ کو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں تقریباً دیرھ سال کا عرصہ ہوتا ہے..... کتنے اچھے تھے وہ دن.....“ جیسے جذبات اسے ماضی کی طرف ڈھکیلے جا رہے تھے۔ اس کے لہجے کی اداسی بڑھتی چلی گئی تھی چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ چلا تھا۔ وہ اسی طرح جملہ کو ادھورا چوڑ کر ماضی کے اچھے دنوں میں شاید کھو گئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ چینی سے وابستہ وہ کونسی سہانی یادیں ہوں گی جنہوں نے یک لخت اسے اس قدر افسردہ

اور ہوش باختہ کر دیا تھا۔ اس کی شوخی اور چہرے کی شفقت کو ایک ہی لمحے میں اس سے چھین لی تھیں۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے چلے گئے۔

”معلوم ہوتا ہی بہت ساری اچھی سی یادیں وابستہ ہیں آپ کی چینی شہر سے!“

”جی ہاں..... کس کا تعلیمی دور حسین نہیں ہوتا!“

”کہاں ہوئی تھی آپ کی تعلیم؟“

”پریسی ڈنسی کالج میں“

”سچ! کیا سبکٹ تھا آپ کا؟“

”انگریزی ادب میں پی۔ جی کیا تھا۔“

”بڑی خوش قسمت نکلیں آپ تو.....“ میں نے اس کی افسردگی کو

دور کرنے کی سعی کی۔ پریسی ڈنسی کالج میں داخلہ ملنا اور پھر انگریزی ادب میں۔ بھلا کس کو ناز نہ ہوگا اس بات پر!

”ہاں! سچ کہا آپ نے۔ میں تو بھلا ہی نہ سکوں گی اس دور کو۔“

وہ پھر اپنے ماضی کے دلفریب سپنوں میں کھوتی نظر آئی۔

”کیا سوچنے لگیں آپ۔“

”جی!..... بس کچھ نہیں..... آپ بھی اس کالج کے اسٹوڈنٹ رہ چکے ہیں کیا؟“

”یہ خوش قسمتی نہ ہو پائی لیکن میرا ایک گہرا دوست جاوید وہاں کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔“

جملے کے اختتام پر اچانک تہم دونوں ہی چونک پڑے میرے دماغ میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ ایک شک بجلی کی طرح لہرا گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”بھلا کس سال ختم کیا تھا آپ نے ایم۔ اے۔“

”دو سال پہلے۔“

”دو سال پہلے!..... پریسی ڈنسی..... انگریزی ادب ثریا۔“

تیزی سے میرا دماغ ان کڑیوں کو جوڑنے لگا۔

”آپ جاوید کو تو نہیں جانتیں؟!“

میں نے ثریا کو ٹٹولا!

جی! ثریا کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جاوید کا نام دوبارہ سن کر وہ شپٹاسی گئی تھی۔

”ہاں جاوید کو..... جس نے دو سال پہلے پریسی ڈنسی سے ایم۔ اے کیا تھا..... انگریزی ادب میں ہی!“

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ اس کے پورے جسم پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں پھاڑے بری طرح تکتی رہی اور پھر اس کی نگاہیں اپنی آپ جھکتی چلی گئیں اور میں سوچنے لگا۔ کیا یہ وہی ثریا ہے جس نے پیار تو جاوید سے کیا تھا۔ لیکن شادی بمبئی کے ایک فونڈری مالک سے رچالی۔ یہ آج دولت میں عیش کر رہی ہے اور وہ بیچارہ اس صدمہ سے پاگل بنا پھر رہا ہے۔ میری آنکھوں میں اس کے لئے نفرت اتر آئی۔ جو عورت کچھ ثانیوں پہلے معصومیت کی دیوی نظر آ رہی تھی اس نے اب ڈائن کاروپ دھار لیا تھا۔ وہ اب میری نگاہوں میں کانٹا بن کر چھبنے لگی تھی، مجھے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے آگے بیٹھنا گوارا نہ ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”سنئے!“

اس کی کانپتی ہوئی آواز پر میرے قدم رک گئے۔

”آپ چل پڑے؟“

”میں نے کچھ نہیں کہا صرف ایک اچلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور

منہ پھیر لیا۔

”آپ جاوید صاحب کے متعلق جانتے ہیں؟“

”ہاں سب کچھ اور.....“ میں نے اس کی طرف دیکھا..... ”اور

اب تو آپ کے متعلق بھی جان گیا ہوں بیچارے کو کیا پتہ کہ کس بے و خا کی یاد میں پاگل بنا مارا مارا پھر رہا ہے وہ اب کس مزے سے عیش کی داد دے رہی ہے!“

ایک لمحے تک خاموشی رہی۔ پھر وہ دھیمی سی آواز میں

گویا ہوئی، ”۔

”آپ اس ملاقات کا حال جاوید صاحب کو نہ سنائیے گا۔ یہ میری

عاجزانہ گزارش ہے آپ سے.....“

اس کی آواز بھر آئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی

ڈبڈبا آئی ہیں لیکن میرے دل پر ان حربوں کا جادو نہ چل سکا۔ اور میں نے

گویا دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوا۔

”اب آنسوؤں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جاوید کی

زندگی میں زہر گھول کر جی نہیں بھرا تمہارا جواب فونڈری کی مالک سے شادی رچا

کر اس کی جان تلخ بنا رہی ہو۔ یقیناً تم ہر جاتی ہو اور اب جبکہ تمہارا راز فاش

ہو گیا ہے تو آنسو بہا کر مجھے ہموار کرنے کی کوشش کر رہی ہو.....“

میں نے سگریٹ کو بوٹ تلے روندھ ڈالا اور اس کی بات کا کوئی

جواب دیے بغیر باہر نکلنے کے لئے مڑا اور اسی وقت ایک جانے پہچانے چہرے سے مڈ بھيڑ ہو گئی۔ وہ میرے بڑے بھائی کے ایک دوست کا لڑکا تھا۔ بمبئی ہی میں اپنے والد کے ساتھ بزنس کر رہا تھا۔

اوہ! چاچا جان۔ آپ؟

”آداب عرض“ تم یہاں کیسے؟

”ارے! آپ نے انھیں نہیں پہچانا؟ اس نے ثریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو بالکل سراسیمگی کے عالم میں ہم دونوں کو تکتے جا رہی تھی۔“ یہ میری امی جان ہیں!“

”کیا بک رہے ہو؟“ مجھے اپنی دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔

”لگتا ہے آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے چچا جان! ڈاڈی نے پچھلے سال شادی کر لی۔“

”اور تمہاری ماں؟“

”انہیں گزرے دو سال ہو گئے۔“

”تو یہ بات ہے!“

میں نے جلدی سے ثریا کی طرف دیکھا اور ثریا نے اپنی نگاہیں جھگالیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ دولت کی ہوس انسان کو کس قدر بچ بنا دیتی ہے۔ دولت کے لئے ایک پچاس سالہ رنڈوے کو اپنا لیا! مجھے ثریا کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ ہوا۔ پھر میں جاوید کی معصوم محبت پر سوچتا سوچتا کھوسا گیا اور جب اس سوچ سے باہر نکلا تو مجھے اس لڑکے کی آواز سنائی دی۔

”مجھے ایک کال کرنی ہے چچا جان۔ میرے آنے تک آپ امی جان سے بات کیجئے گا۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور میں ثریا کی طرف توجہ کئے بغیر اٹیچی کیس اٹھا کر مڑ گیا۔

”سنیئے؟“

اس کی آواز کی کپکپاہٹ پر میں چونک پڑا۔ میرے قدم یک بیک رک گئے۔ آواز کی تہہ میں یہ درد کیسا تھا؟!۔

”خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ آپ جاوید صاحب کو اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتائیے گا۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ میری قسمت نے

مجھے ایک عمر رسیدہ آدمی کی جھولی میں ڈال دیا ہے تو ان کا صدمہ دوگنا ہو جائے گا۔“

”خواہ مخواہ قسمت کو کیوں کوس رہی ہیں آپ“

”خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے۔“ آواز اس کے حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈباتی تھیں مجھے محسوس ہوا جیسے آنسوؤں میں تیرتے ہوئے دوسرخ شعلے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

”عورت ذات کی محرومیوں کا اندازہ آپ کر نہیں سکتے۔“

”میں سمجھ نہیں سکا آپ کی بات!“

”آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ایک کنواری لڑکی کی لئے والدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی ایک ایک سانس؟ ان کی مسرتوں کا ایک ایک پل اس کے لئے کتنا قیمتی ہوتا ہے.....“

”میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا کہ یہ عورت آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ اس لئے میں نے وضاحت طلب نگاہوں کے اس طرف دیکھا۔

”کوئی کنواری لڑکی اپنی وجہ سے اپنے والدین کے ماتھے پر

پریشانیوں کی لکیریں ابھرتے دیکھتی ہے تو تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ والدین کے ماتھے پریشانیوں کی لکیریں دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ان لکیروں کو مٹانے۔ ان کے ہونٹوں سے چھنی ہوئی مسکراہٹ واپس لے آنے کے لئے زندگی کیا ہے اگر اپنی جان کی بھینٹ بھی دینی پڑے تو وہ بخوشی صلیب پر چڑھ جائے گی۔“

”صلیب پر چڑھ جائے گی؟“

”ہے نا عجیب بے تکی بات!“

اس کے ہونٹوں پر ایک زیر خندا بھرا آئی۔ پرویز صاحب آپ مرد ہیں اور مرد قیامت تک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ کس نے سمجھی ہے ہماری بے بسی جو آپ سمجھ جائیں گے۔ دنیا نے کسے چھوڑا ہے۔ حضرت مسیح تک کو نہیں بخشا۔ ہم تو پھر بھی عورتیں ہیں۔ بے بسی اور محرومیوں کی پٹلیاں جن کی قسمت کی ڈور سماج کی انگلیوں میں پھنسی رہتی ہے.....

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ بحث سے کیا حاصل۔ میری تو آپ سے بس یہی بنتی ہے کہ آپ جاوید کی نظر میں مجھے بے وفا ہی رہنے دیں۔ یہ..... آپ کا مجھ پر..... بہت بڑا..... احسان ہوگا۔“

سسکیوں کی تار نے اسے آگے کہنے نہ دیا اور اس نے اپنی آنکھوں

پر آنچل ڈال لیا۔ اور میری نگاہیں بھی آپ ہی آپ نم ہوتی چلی گئیں۔

اُف! میں نے کیا کیا سوچ ڈالا تھا اس مظلوم کے بارے میں،
ندامت سے جیسے میں زمیں میں دھنستا چلا گیا، کسی شاعرہ نے یہ مصرعے شاید اسی
کے لئے کہے تھے۔

اسیر شام تنہائی میں یہ آخر گلہ کیسا

تجھے تو علم تھا زنجیر کا میری

جو پیروں میں بھی ہے

اور روح پر بھی

میں اپنے بخت کی قیدی ہوں!

ثریا تو سرتاپا بندھنوں کی قیدی تھی!

میں نے بہ وقت تمام ایک مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی اور بو جھل
قدموں کے ساتھ وہاں سے کھسک آیا!..... اس کے سوتیلے لڑکے کا انتظار
کئے بغیر!!

مختصر سوالات:

I

فسٹ کلاس وٹنگ روم میں کون موجود تھے؟

(1)

- (2) وٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے فن کار کو کیا سوچھی؟
- (3) پرویز نے خاتون سے گفتگو کا آغاز کس طرح کیا؟
- (4) خاتون کا نام کیا تھا اور اس کے شوہر کہاں اور کیا کام کر رہے تھے؟
- (5) ثریا کی تعلیم کہاں ہوئی اور اس کا سبکٹ کیا تھا؟
- (6) جاوید کا نام سن کر ثریا کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگیں؟
- (7) پرویز نے جاوید کے متعلق کیا کہا اور جاوید کا نام سن کر ثریا نے کیا کہا؟
- (8) پرویز کی مڈ بھیڑ کس سے ہوئی اور وہ کون تھا؟
- (9) لڑکے کا جواب سن کر پرویز کے دل میں ثریا سے متعلق کیا تاثر قائم ہوا؟
- (10) خدا کا واسطہ دے کر ثریا نے پرویز سے کیا کہا؟

II توضیحی سوالات:

- (1) پرویز کی ملاقات ثریا سے کہاں اور کس موضوع پر ہوئی؟
- (2) ثریا کے کردار پر روشنی ڈالئے؟
- (3) ثریا نے اپنی محرومیوں کی داستان پرویز کو کیوں سنائی؟
- (4) پرویز پر اس داستان کا کیا اثر پڑا؟
- (5) کہانی ”صلیب“ کا مرکزی خیال واضح کیجئے؟

فقیر

عظیم بیک چغتائی

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں غسل خانے سے نہا کر برآمدہ میں جو نکلا تو کسی فقیر نے سڑک پر سے کھڑکی کی چلمن میں شاید پر چھائیں یا جنبش دیکھ کر صدا دی، ”مائی تیرے بیٹا ہوئے“ در حال یہ کہ نہ تو یہاں کوئی مائی تھی اور نہ کسی کو یہ گھبراہٹ تھی کہ ایک عدد لڑکا خواہ مخواہ تولد ہوتا پھرے۔ دراصل یہ فقیر ان میں سے تھا جو مانگنا بھی نہیں جانتے۔ ذرا اس احمق سے کوئی یہ پوچھتا کہ بے وقوف یہ کون سی عقل مندی ہے کہ کسی سوراخ میں سے کوئی بھی ہلتی چیز دیکھ پائی اور بیٹا بیٹی تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ پھر مجھے فقیروں سے ویسے بھی بغض ہے۔ کیوں کہ جب کبھی مجھے کوئی فقیر ملتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں تو ایسا پاتا ہوں کہ مجھ سے دو کو کافی ہو۔ چنانچہ میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے چق اٹھا کر اس نیت سے دیکھا کہ اس سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ نوکری کرے گا؟

لیکن جب میں نے دیکھا تو ایک قابلِ رحم ہستی کو پایا۔ ایک فاقہ زدہ، ضعیف العمر چیتھڑے لگائے، بے کسی او بے بسی کی زندہ تصویر تھا۔ سچ ہے ان لوگوں کو مانگنا بھی نہیں آتا۔ نہ تو یہ کوئی عمدہ گیت جانتے ہیں، نہ کوئی لے جانتے ہیں، نہ صدا جانتے ہیں۔ بس پیسے لیے اور دانت نکال دیے۔ یہ دکھانے کو کہ

دیکھو ہم بھی اس دنیا میں رہتے ہیں اور یوں رہتے ہیں۔ مجھے اس کی حالت زار دیکھ کر بڑا رحم آیا اور میں نے اس سے کہا کہ گھوم کر صدر دروازے پر آ جائیے۔

صبح کا وقت تھا، میں چائے پینے لگا، اور گھر والی سے کہا کہ ایک انتہا سے زیادہ قابلِ رحم فقیر آیا ہے، اسے دو چار پیسے دے دو، اور صبح کا وقت ہے دو تو اس اور ایک پیالی چائے دے دو۔

جتنی مسٹنڈے فقیروں سے مجھے نفرت ہے اس سے دو گنی نفرت میری بیوی کو ہے اور اسی مناسبت سے ان فقیروں یعنی محتاجوں سے الفت ہے جو واقعی رحم و کرم کے مستحق ہیں۔

خانم نے فقیر کا نام سن کر جلدی جلدی گریما گرم تو سوں کو انگلیٹھی پر سینک کر خوب مکھن لگایا اور ایک پیالی میں خوب بہت سا دودھ ڈال کر چائے بنا دی اور مزید برآں کچھ مٹھائی بھی رکھ دی، اور سینی میں چار پیسے رکھ دیے اور لڑکے سے کہا: ”فقیر کو صدر دروازہ سے اندر یعنی برآمدہ میں بٹھا کر کھلا دے۔“

اب قسمت تو ہماری ملاحظہ ہو کہ وہ غریب محتاج جسے میں نے بلایا، صدر دروازہ کی پشت پر تھا، گھوم کر آ جانا اس کے لیے مشکل ہوا، یا آتے میں کسی دوسرے سے مانگنے لگا ہو گا یا پھر اپنی راہ کھوٹی نہ کرنا چاہتا ہو گا۔ قصہ مختصر، وہ تو آیا نہیں اور اس کے بدلے پھاٹک میں ایک اور فقیر صاحب داخل ہوئے اور اپنی صدا لگانے بھی نہ پائے تھے کہ کتنے نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے پاس ایک موٹا

ڈنڈا تھا، اس کی دو چار ہاتھ نہ گھمانے پائے تھے کہ لڑکا ناشتہ لے کر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک فقیر صاحب گلے میں مالا ڈالے موٹا سا فقیرانہ ڈنڈا اور فقیرانہ لباس، گلے میں جھولی، ہاتھ میں چمبل، تہبند باندھے موجود ہیں۔ اس نے کتے کو ڈانٹا، اور کہا سائیں جی برآمدے میں آ جاؤ۔ سائیں جی نے غنیمت سمجھا اور ناشتہ شروع کیا، اور ادھر میں نے خانم سے کہا کہ پرانا سویٹر اور ایک قمیص فقیر کو اور بھیج دو، سردی کا وقت ہے اور غریب مر رہا ہوگا جاڑے میں۔ خانم نے جلدی سے ایک قمیص اور سویٹر پرانا لیا اور لڑکے کو دیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا کہ فقیر کیا کہتا ہے؟ لڑکے نے کہا خوب دعائیں دے رہا ہے اور کھا رہا ہے۔ لڑکا قمیص اور سویٹر لے کر پہنچا اور وہ بھی فقیر صاحب کی زندگی کی نذر کیا۔ اتنے میں میں چائے پی کر باہر نکلا کہ فقیر کو گرم کپڑے پہنے ہوئے دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہو سکتی ہے، اس سے لطف اٹھاؤں۔

میں باہر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹا کٹا، انتہا سے زیادہ مضبوط فقیر ڈکاریں لے رہا ہے اور سویٹر اور قمیص ہزاروں دعاؤں کے ساتھ لپیٹ کر جھولی میں رکھ رہا ہے۔ دراصل یہ مسٹنڈا صرف ایک سینہ کھلی فقیروں والی کفنی پہنے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی سردی ہوا سے لطف اٹھا رہا ہے۔ سینہ اونچا، داڑھی منڈی ہوئی بلے چڑھے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت لگے مجھے دعائیں دینے۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں، سارا کھایا پیا خون ہو گیا، جان سلگ کر رہ گئی۔ جی میں تو یہی آیا کہ اس کم بخت کا منہ نوچ لوں جٹا اور چہل اٹھا کر لگے حضرت دعائیں دے کر رخصت ہونے۔ دعاؤں میں مبالغہ اور غلو سے میری اور بھی جان جلی۔ اتنے میں خانم نے بھی جھانک کر دیکھا، وہاں بھی یہی حال ہوا۔ اب بتائیے کیا کیا جاسکتا تھا؟ یہ ناممکن تھا کہ میں ان حضرت کو اس طرح ستم توڑ کر چلا جانے دوں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرے ایک دوست بھی آگئے۔ میں نے دو لفظوں میں فقیر کی ستم آرائی بیان کی اور پھر فقیر سے کہا: ”تمہیں شرم نہیں آتی.....؟“

سادہ لوحی تو دیکھیے کہ یہ حضرت اس ریمارک کو سن کر اپنی تہ کی طرف متوجہ ہو کر محض میری جان حزیں پر کرم گستری کے خیال سے ذرا نیچے کر لیتے ہیں۔ ”کم بخت!“ میں نے اور بھی جل کر کہا، ”اتنی موٹے ٹکڑے ہو کر بھیک مانگتے ہو، بڑے شرم کی بات ہے۔“

اس کے جواب میں فقیر صاحب نے اپنے پیدائشی حقوق کا اعادہ کرتے ہوئے ان سے دست برداری سے معذوری ظاہر کی، اور اب میں یہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس بدتمیز سے کم از کم سویٹر اور قمیص ہی چھین لی جائے۔ میرے دوست نے کہا، یہ مناسب نہیں ہے مگر حضرت وہ جو کسی نے کہا ہے۔

درد اس سے پوچھیے، جس کے جگر میں ٹیس ہو۔

میں نے کہا کہ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، میں اس موذی کو یہ چیزیں ہرگز ہضم نہ کرنے دوں گا۔ میں نے اب اس محتاج کی تلاش کرائی، ملازم اسے تلاش کرنے گیا، اور میں نے ادھر فقیر صاحب کو لیا آڑے ہاتھوں۔ میں نے کہا: ”تم نوکری کیوں نہیں کرتے؟“

وہ کچھ جل کر بولا، ”آپ ہی رکھ لیجیے۔“

میں نے فوراً رضا مندی ظاہر کی اور دس روپیہ ماہ وار اور کھانا تجویز کیا۔ فقیر صاحب اس کے جواب میں بولے: ”اور گھر والوں کو زہر دے دوں؟“

میں نے کہا ”کیوں؟“

وہ بولا، ”آپ دس روپیہ دیتے ہیں، ڈھائی آنہ روز کا تو گائے رزقہ کھاتی ہے، اور ایک بیوی تین بچے، پانچ روپیہ میں گزر کیسے ہو؟“
”گائے بھی ہے تمہارے پاس؟“ میں متعجب ہو کر کہا۔

وہ بولا، ”صاحب آپ بڑے آدمی ہیں، ہم بھلا کہاں سے پیسہ لائیں جو روز تین سیر دودھ خریدیں؟“

”تین سیر؟“ میں نے متعجب ہو کر کہا۔ ”تین سیر! بھئی تین سیر کا خرچ کیسا؟“ معلوم ہوا، خیر سے خود حضرت دو سیر دودھ یومیہ نوش کرتے

ہیں۔ میں پھر تنخواہ کے سوال پر آیا تو عسرت کی شکایت کرتے ہوئے تیس روپیہ ماہ وار کا خرچ گھر کا بتایا اور قائل ہو کر کہا کہ اگر کم و بیش کسی روز گار میں اتنی کمائی ہو جائے کہ تنگی ٹرشی سے بھی گھر کا خرچ چل جائے، تو فقیری چھوڑنے کو ابھی ابھی تیار ہیں۔

اب میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں، اور وہ میری طرف۔ پھر معلوم ہوا کہ حضرت دوپہر کی قیلولہ کے سخت عادی ہیں، اور کسی صورت میں بھی دوپہر میں تو کام کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے ہر طرح کوئی پیشہ، دھندا، نوکری، غرض جو بھی بتاؤ اس کے لیے حاضر ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ میں اس موذی کو کیا جواب دیتا۔ میرا وہ حال کہ مرے پر سودرے۔ اتنے میں ملازم آیا۔ باوجود سخت تلاش کے وہ محتاج نہ ملا۔ اگر میرے دوست نہ ہوتے تو غالباً میں اس موذی سے ضرور کپڑے چھین لیتا۔ مگر میں نے اور ترکیب سوچی۔

میں نے قطعی طور پر فقیر صاحب سے کہا کہ میں تمہیں اس حرام خوری کی سزا دیے بغیر ہرگز نہ جانے دوں گا۔ پچاس دفعہ کان پکڑ کر اٹھو بیٹھو، اور خبردار جو پھر کبھی اس طرف رخ کیا۔

فقیر نے غصے کے شعلے میری آنکھوں میں دیکھے۔ ممکن ہے کہ یہی سوچا ہو کہ سویٹر اور قمیص دونوں بالکل ثابت ہیں، سودا پھر بھی برا نہیں، نہایت ہی خاموشی اور سادگی سے آپ نے ڈنڈا اور پیالہ اپنا ایک طرف رکھا، جھولی

اور مالا اتار کر رکھا اور تہہ اونچی کر کے کسنے لگا کہ میں نے ڈانٹا ”بدتمیز!“ اس کے جواب میں وہ مجھے نہایت ہی مطمئن کر کے فرماتے ہیں، ”نیچے جا نکلیا پہنے ہوں“ اور مٹھل ہوگی۔

لیکن میں چوں کہ سزا دینا چاہتا تھا، لہذا میں نے اس کی بھی اجازت دے دی اب یہ حضرت ایک ہنکار کے ساتھ بڑے زور سے ہونہہ کر کے بغیر پکڑے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک سپاٹے کے ساتھ پاؤں سرکا کر بیٹھک لگا گئے۔

”بدتمیز، بے ہودہ“ میں نے جل کر کہا، یاد رکھو، تمہیں پولیس کو دے دوں گا۔ کان پکڑ کر سیدھی طرح اٹھو بیٹھو۔“ دو دفعہ ان کو میں نے کان پکڑوا کر اٹھنا بیٹھنا بتایا اور یہ حضرت سزا بھگتنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ حضرت میری پشت کی طرف تھے اور ہم دونوں دوست فقیروں کو برا بھلا کہنے میں مشغول ہوئے۔

ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ”کان پکڑی“ غالباً پچاس دفعہ ہو چکی۔ مڑ کر میں نے دیکھا، تو سرعت کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ بولا کہ ایک سو دس دفعہ کی۔ میں نے کہا، ”بس! اب جاؤ! میں نے تو پچاس دفعہ کو کہا تھا، زیادہ کیوں کی؟“

وہ بولا، ”صاحب! پانچ سو بیٹھکیں روز لگاتا ہوں، میں نے سوچا

کہ اب بار بار کون کرتا پھرے، لاؤ یہیں پوری کر لوں۔“

”ارے“ میں نے اس کم بخت کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”کیا تو پہلوانی کرتا ہے۔“ واللہ میں نے گویا اب اس کو غور سے دیکھا۔ کان ٹوٹے ہوئے، سینہ اور شانہ اور پیش! خوب کسرتی بدن۔

خواب دیتے ہیں، ”ویسے نہیں کہتا، شہر کے جس ہتھے سے جی چاہے لڑا لیجیے“

میں نے کہا، ”کم بخت جی میں تو ہی آتا ہی کہ تیرا اور اپنا مر ملا کر لڑا لوں۔“

”نکل یہاں سے ابھی ابھی نکل..... نکالو اسے۔“

جلدی جلدی اُس نے اپنی جھولی وغیرہ اٹھائی اور سیکڑوں دُعا نئیں دیتا ہوا چلا گیا اور کم بخت مجھے انتہا سے زیادہ پست اور شکست خوردہ حالت میں چھوڑ گیا۔

اس موذی کا بخار میں نے اور فقیروں پر نکالا، کسی کو نہ دیا، ڈانٹ کر بھگا دیا کہ ایک عرصہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑے ملازمہ سے بحث فرما رہے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ جاؤ آگے بڑھو، اور آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس گھر سے

ہمیشہ ملتا ہے۔ (لفظ) ہمیشہ پر زور، ادھر میں جو آیا تو فوراً مجھے اس امر کی شہادت میں پیش کرتے ہیں اور ٹیپ کا بند ”اللہ بھلا کرے، کچھ سائیں کو بھی۔“

میں نے اُسے پکڑ لیا کہ آج تجھے نہ چھوڑوں گا۔ صحیح عرض کرتا ہوں کہ اس موذی سے کوئی من بھر لکڑیاں پھڑوائیں، چشم زدن میں پھاڑ پھوڑ کر برابر کیوں اور میری کرسی کے پاس آ کر میرے پیر دا بنا شروع کر دے۔ اور کہا ”اللہ بھلا کرے۔“

”ارے کم بخت چھوڑ!“ میں نے بے تاب ہو کر کہا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری کوئی پنڈ لیاں کوئی لوہے کے شکنجے میں دھر کے داب رہا ہے۔

لکڑیوں کی پھڑوائی کے شاید دو آپنے دیے۔ قمیص اور مانگنے لگا۔ وہ نہ دی تو بد معاش کہتا ہے۔ ”بھوکا ہوں۔“

مختصر سوالات:-

- (1) مصنف کو فقیروں سے کیوں بغض ہے؟
- (2) فقیر نے چلمن میں پر چھائیں دیکھ کر کیا صدا لگائی تھی؟
- (3) چائے پیتے ہوئے مصنف نے اپنے گھر والی سے کیا کہا؟
- (4) خانم نے فقیر کا نام سن کر کیا کہا؟
- (5) ناشتہ کے بعد فقیر کو کیا چیزیں پیش کی گئیں؟

(6) فقیر کا حلیہ دیکھ کر مصنف کے دل پر کیا گزری؟

(7) مصنف نے فقیر کو سزا کیوں دی؟

II توضیحی سوالات:

(1) مصنف نے گداگری کی سماجی لعنت کو کس طرح واضح کیا ہے؟ تفصیل کے ساتھ لکھئے۔

(2) فقیروں کی حالت کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا گیا ہے؟

(3) اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے؟